انقلاب کے نقیب قلم کار

ایک سیاست داں کے سماجی شعور کی قلم کاروں کے ذریعہ صورت گری

کیتھ ایلی سن

منیش بخشی/ ایم پی ٹیلیو ڈیلیو پی

کیتھ ایلی سن امریکی کانگریس کے لئے منتخب پہلے مسلمان ہیں۔وہ منیاپولس میں رہتے ہیں اور وہاں کے رنگا رنگ انتخابی حلقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

امریکہ میں قلمکاروں' خاص کر نسل اور ثقافت کے حوالے سے الگ الگ تناظرات کے ساتھ سامنے آنے والے قلمکاروں نے افکار، عقائد اور رویوں کی صورت گری میں ناگزیر رول ادا کیا ہے۔میرے لئے اہم بات یہ ہے کہ کثیر ثقافتی تناظرات سے تعلق رکھنے والے امریکی قلمکاروں نے بچپن سے ہی میرے افکار کو بیدار کرنے میں مدد کی ہے۔ہمارے گھر میں کتابیں ہر جگہ بکھری رہتی تھیں۔ میری والدہ پڑھتی تھیں، میرے والد پڑھتے تھے، ن کی یہ خواہش تھی کہ بچے بھی پڑھیں اور ہم لوگ پڑھتے تھے۔

میں دس سال کا تھا، تبھی میں نے جیمز بالڈوِن کا ناول ''گوئیل اٹ آن دی ماؤنٹین'' پڑھ لیا تھا۔چونکہ میری پرورش سیاہ فاموں کے روایتی گرجا گھروں میں نہیں ہوئی ہے اسلئے بالڈوِن کے بیانیہ سے مجھے سیاہ فاموں کے تجربے کے اس اہم پہلو سے واقفیت حاصل ہوئی جس سے میں نا آشنا تھا۔جب میرے والد نے میری زبان سے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے بارے میں غیر درست باتیں سنیں تو انہوں نے ۱۹۵۵ میں مونٹ گومیری بس بائیکاٹ کے بارے میں کنگ کی لکھی ہوئی کتاب'' اسٹرائڈ ٹو ورڈس فری ڈم'' پڑھنے کو دی۔بعد ازاں انہوں نے مجھے ٹیلر برانچ کی کتاب'' پارٹنگ دی واٹرس: امریکہ ان دا کنگ ایئرس ۶۳-۱۹۵۴'' پڑھنے کو دی۔

بلوغت تک پہنچتے پہنچتے میں جرائم سے متعلق کہانیاں پسند کرنے لگا۔میں نے والٹر موسلی کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں'' ڈیول ان بلیو ڈریس''، ''اے لٹل یلو ڈاگ'' اور'' بلیک بیٹی'' شامل تھیں۔جاسوس ایزی رولنس بہت ٹھنڈے دماغ کا تھا اور بہت چالاک بھی تھا۔ میں نے ڈونالڈ گوئنس کی کتابیں پڑھیں اور انہیں بہت دلچسپ پایا کیونکہ ان میں سیاہ فاموں کے ایک اور پہلو کا بیان تھا جس سے میں واقف نہیں تھا: ایک خاص قسم کی غریبی ،جرائم اور افریقی امریکی وجود کا ایک گنجان علاقہ۔مجھے لگتا ہے کہ اس وقت میری خواہش ہوتی تھی کہ میں اس فرضی سیاہ فام کے بارے میں جان سکوں جو میں ہوتا۔میں نے جان ہوورڈ گریفن کا ناول'' بلیک لائک می'' پڑھا جس میں ایک ایسے سفید فام کی کہانی ہے جو کہ کیمیائی طریقہ سے اپنی جلد کی رنگت بدل لیتا ہے تاکہ امریکہ میں سیاہ فام کی زندگی گزار سکے۔ٹونی موریسن کی کتاب'' بی لَو وڈ'' کسی بھوت پریت کی کہانی تھی یا کسی ایسی خاتون کی جو غلامی کے نفسیاتی زخم جھیل رہی تھی؟ کثیر ثقافتی مصنفین نے امریکہ کے بارے میں میری اس فہم کو گہرائی اور گیرائی دینے میں مدد کی کیونکہ انہوں نے ایک ایسا تناظر پیش کیا جس طرف سے اسکول میں غفلت برتی جاتی تھی۔میری بلوغت اور نوجوانی کے دن کتابوں کے ارد گرد گھومتے ہیں۔یہ میرے تشکیلی خواندگی تجربات تھے جنہوں نے مجھے انصاف کے حصول کے راستے پر ڈال دیا۔

الیکس ہیلی کی'' آٹو بایوگرافی آف میلکم ایکس'' نے میرے چہرے پر تھپڑ مارا۔وہ جرائم سے تعلق رکھنے والے ناول جیسا تھا۔اس میں کافی پیچ تھے، کافی موڑ تھے اور حالات کی ستم ظریفی تھی۔اس کہانی میں ایک سیدھے سادے دیہاتی شخص کے اندر ہونے والی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے جو بوسٹن میں ایک موالی بن گیا۔وہ جیل میں ایک قیدی سے نیویارک میں ایک آتش بیان سیاہ فام لیڈر بنا اور اس کے بعد ترقی کر کے ایک ایسی شخصیت میں تبدیل ہو گیا جسے لوگ اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھتے تھے۔میلکم ایکس سے اسلام میں میری دلچسپی اچانک بہت تیز ہو گئی۔یہ دوسری بات ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے کئی مہینے بعد میں پہلی بار مسجد گیا۔میلکم ایکس نے نو آبادیات سے ابھرتی ہوئی ایک دنیا اور جم کرو کے نسلی تفریق سے ابھرتے ہوئے ایک امریکہ کو بیان کیا ہے۔گزرے ہوئے زمانے سے بارک اوباما کے الیکشن تک کا احاطہ کرتی ہوئی اس کتاب میں امریکی افکار کے چوراہوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ بیلٹ یا بلٹ؟ شہری وابستگی یا اپنے اوپر مسلط کردہ بیگانگی؟ اس کتاب میں غیر متشدد باوقار نعرہ تبدیلی اور تبدیلی کیلئے عسکریت پسند غصہ ور مطالبہ کے درمیان کشیدگی کا بیان ہوا ہے۔مارٹن بمقابلہ میلکم۔۱۹۸۱ میں جب میں کالج میں داخل ہو رہا تھا اس وقت میں نے میلکم ایکس پڑھی۔کتاب پڑھنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس کتاب سے میرے اندر جذبات میں پیدا شدہ ہل چل کا میں کیا کروں؟ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ مجھے اپنی پوری زندگی اس دنیا کو بہتر بنانے کے لئے صرف کرنی ہے۔تاہم میرے اٹھارہ سال کے دماغ میں بہتر دنیا کا تصور بہت مبہم تھا۔میں نے خود کو اپنے کالج کی سرمایہ کاری کو ساؤتھ افریقہ سے نکال لانے کی کوششوں میں مصروف پایا۔نسل اور شمولیت کے امور پر کالج کے اخبار میں لکھنا شروع کیا اور سیاہ فام طلبا کی یونین میں سرگرم عمل ہو گیا۔

اب میں ۴۵ سال کا ہوں۔اور جنگ آج بھی جاری ہے۔لوگ اب بھی فاقہ کرتے ہیں۔ناانصافی اب بھی ہوتی ہے۔ اور میں اب بھی اپنی جگہ ثابت قدم ہوں۔اس کوشش میں ہوں کہ ایک کتاب پڑھنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں میرے ذہن میں جس تبدیلی کی خواہش بیدار ہوئی تھی وہ تبدیلی لانے کی کوشش جاری رکھوں۔